حبیب کیفوی

کشمیر کی ایک اقبال شناس شخصیت

(منشی سراج الدین احمد)

برِصغیر میں جہاں بھی اُردو زبان بولی ، سمجھی ، پڑھی اور لکھی جاتی ہے وہاں کے پڑھے لکھے لوگ علامہ اقبال اور ان کے کلام سے مانوس ہیں ۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی جب کہ ان کی شاعری ابھی ابتدائی دور میں تھی ان کی قدر و منزلت شروع ہو چکی تھی ۔ وہ اس دور کے بچوں کے بھی محبوب شاعر تھے ۔ بچوں کے نصاب میں ان کی نظمیں شامل تھیں جو اتنی دل کش تھیں کہ بچوں کو زبانی یاد ہو جاتی تھیں (یہ نظمیں ''بانگِ درا'' میں شامل ہیں) ۔ ان کا کلام ''مخزن'' میں شائع ہونے لگا تو ان کے کلام کے قدر دانوں اور اقبال شناسوں کا حلقہ وسیع ہوگیا ، لیکن جب ان کے کلام کے یکے بعد دیگرے مجموعے چھپے تو ان کی شہرت برِ صغیر تک محدود نہ رہی ، ساری دنیا میں ان کے افکار کی قدر ہونے لگی ۔ ہر ملک میں اقبال شناسوں کا حلقہ پیدا ہو گیا ۔ چنانچہ دنیا کی کئی زبانوں میں ان کے کلام کے تراجم چھپ چکے ہیں اور ان پر تحقیقاتی کام ہو رہے ہیں ۔

کشمیر بھی کسی ملک سے پیچھے نہیں رہا ۔ یہاں بھی اقبال شناسوں کی کمی نہیں تھی ۔ یہ خطہ تو ہمیشہ علم و ادب کا گہوارہ رہا ۔ خطے کی رعنائی کے اعتبار سے فطرتاً اس ملک کے باشندوں کو علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کی دوسری شاخوں سے گہری رغبت رہی ہے ۔ پھر اقبال ایسے بے مثال شاعر کے فن سے کیسے بے گانہ رہ سکتے تھے !

کشمیر میں اقبال شناسی میں کشمیر ریذیڈنسی کے میر منشی سراج الدین احمد کو جو مقام حاصل تھا ، اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ کشمیر ریذیڈنسی کے دفاتر سردیوں میں سری نگر سے سیالکوٹ آ جاتے تھے ۔ سیالکوٹ کے قیام کی وجہ سے علامہ اقبال سے ان کے گھریلو مراسم تھے اور یہ رشتۂ محبت و عقیدت علامہ کے آخری ایام تک قائم رہا ۔

منشی سراج الدین باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ۔ انھوں نے نصف صدی تک خطۂ رنگ و بو کی علمی ، ادبی اور ثقافتی مجلسوں کو گرمائے رکھا اور

ع ہے وہ رونق محفل جس انجمن میں رہے

وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے ۔ جب تک زندہ رہے خود ہنسے اور دوسروں کو ہنسایا ۔ اس طرح ان کی شگفتہ مزاجی اور شگفتہ بیانی ان کے حلقۂ احباب کے لیے مستقل سہارا بنی رہی ۔ انھیں قدرت نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہوا تھا ۔ بلا کا حافظہ پایا تھا ۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا ۔ ان کا عزیز سے عزیز دوست بھی ان کے لطیف مزاح کی زد سے محفوظ نہیں تھا ، بلکہ زد پر آنے والے احباب نے بھی ان کے مزاح کا لطف اُٹھایا ۔

وہ کالج کی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر ۱۸۹۲ میں اسلامیہ ہائی سکول ، شیرانوالہ گیٹ ، لاہور ، میں بطور مدرس ملازم ہو گئے ، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد ہیڈ ماسٹر سے ان بن ہو گئی اور ملازمت کو خیر باد کہہ دیا ۔ اتفاق سے ایک روز لاہور میں علامہ میر حسن مرحوم کے فرزند ڈاکٹر تقی سے ان کی ملاقات ہو گئی جو گورنر پنجاب کے سٹاف میں تھے اور ان سے منشی صاحب کے دیرینہ مراسم بھی تھے ۔ باتوں باتوں میں سکول کی نوکری چھوڑنے کا ذکر آ گیا تو ڈاکٹر تقی نے انھیں بتایا کہ کشمیر ریذیڈنسی میں چند آسامیاں خالی ہیں ۔ وہ اس کے لیے درخواست دے دیں اور اس سلسلے میں ان کے والد علامہ میر حسن سے ملیں ، کیونکہ ریذیڈنٹ کشمیر سے ان کے بڑے اچھے تعلقات ہیں ۔ ریذیڈنٹ کشمیر کو فارسی ادب کا بڑا ذوق تھا اور اسی ذوق کی بدولت وہ علامہ میر حسن

سے عزت و احترام سے ملتا تھا ۔ منشی سراج الدین سیالکوٹ پہنچے اور علامہ سے سفارش کی استدعا کی ۔ علامہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور ان کی سفارش سے ریذیڈنسی میں ملازمت مل گئی جہاں وہ اپنی خدا داد صلاحیتوں کی وجہ سے میر منشی کے منصب پر پہنچ گئے ۔ شعر و سخن کا ذوق حد کمال تک پہنچا ہوا تھا ۔ اُردو اور فارسی کے ہزاروں اشعار انھیں یاد تھے ۔ خود بھی شعر کہتے تھے لیکن تفریحاً ۔ اپنے کلام کو وہ افکار ہنگامی کہا کرتے تھے ۔ ان کا مجموعۂ کلام جو ان کے ہاتھ سے بڑا خوش خط لکھا ہوا ہے ان کے صاحب زادے امیر الدین کے پاس میں نے دیکھا ہے ۔ اس میں غزلیں بھی ہیں ، لیکن زیادہ تر دوستوں کے سہروں اور تہنیت ناموں پر مشتمل ہے ۔ اُن کے کلام کا وہ حصہ بہت دلچسپ ہے جس میں طنز و مزاح کا رنگ ہے ، مثلاً ان کے ایک ہم مجلس اور دوست ریاست میں اچھے عہدے پر فائز تھے اور سیاہ فام تھے ۔ اس کے ساتھ انھیں شدید قسم کی دین داری کا بھی دعویٰ تھا اور معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کو کافر بناتے رہتے تھے ۔ منشی صاحب بھی ان کے فتووں سے محفوظ نہیں رہتے تھے ۔ آخر منشی صاحب کے ترکش سے بھی مزاح کے چند تیر نکل کر ان کے سینے میں پیوست ہوگئے ۔ اسی طرح منشی صاحب نے اگلا پچھلا حساب چکا لیا :

سوادِ خامہ کیوں ظلمت فشاں ہے — کسی زنگی کی لکھی داستاں ہے
چہ زندگی منکر از اعجاز پیری — چہ زنگی منحرف از دستگیری
بظاہر گرچہ او اُلفت شعار است — مگر در کینہ افزوں تر ز مار ست

منشی صاحب کو گو بدیہہ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا ، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شاعر کہلانے سے گریز کرتے تھے ۔

فروری ۱۹۱۰ء میں انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے جلسے میں میاں سر محمد شفیع صدر مجلس تھے ۔ آپ نے فی البدیہہ ذیل کے قطعات کہہ کر داد سمیٹی :

رتبہ ہماری قوم کا یا رب رفیع ہو
چھوٹے بڑے کی سب کی نظر میں وقیع ہو

دنیا کے مخمصوں کا ہمیں ڈر نہیں رہا
کیا غم ہمیں جو اپنا محمد شفیع ہو

اسی جلسے میں اللہ یار خاں جوگی بھی موجود تھے جنھیں وہ اپنا شاگرد ظاہر کرتے تھے ۔ ایک قطعہ میں کہا :

جوگی کے در معنی پہ سب لوگ ہیں مفتون
کیا شعر دلآویز ہیں کیا تازہ ہیں مضمون
ہم دونوں سے یہ بزم بنی خطۂ یونان
میں اس کا ارسطو ہوں تو وہ میرا فلاطون

کشمیر میں علمی اور ادبی جماعتوں کو ہمیشہ ان کی سرپرستی حاصل رہی ۔ اُنھوں نے کشمیر میں اُردو کی ترویج و ترقی میں نصف صدی تک بڑی سرگرمی سے کام کیا ۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ۔ چنانچہ ان کی مشفقانہ سرپرستی نے کشمیر میں نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کر دی تھی ۔

منشی صاحب کو مطالعے کا بے حد شوق تھا اور یہ شوق ان کی زندگی بھر کا معمول رہا ۔ شام کو احباب سے مجلس آرائی کے بعد بستر پر بیٹھے بیٹھے مطالعہ کرتے رہتے ۔ کھانا بھی وہیں کھاتے اور مسلسل تین چار گھنٹے بلا ناغہ مطالعہ میں صرف کرتے ۔ ان کے کتب خانے میں تین چار ہزار کے قریب کتابوں کا ذخیرہ تھا جن میں سے ڈیڑھ سو کے قریب عربی و فارسی کے نادر قلمی نسخے تھے جو انھوں نے کشمیر اور وسط ایشیا کے ملکوں سے فراہم کیے تھے ۔ ان میں کئی نسخے ایسے تھے جو زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئے تھے ۔ اُنھوں نے ان میں سے کئی نسخے عجائب گھر لندن لائبریری کی نذر کر دیے تھے ۔ لائبریری کے ایجنٹ نایاب کتابوں کی تلاش میں کشمیر کی سیاحت پر آتے تھے تو وہ ان کے نسخوں کا جائزہ لیتے رہتے ۔ وہ بھی کوئی نیا نسخہ حاصل کرتے تو لائبریری کے منتظموں کو اطلاع دے دیتے اور ان کی یہ اطلاع قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ۔ اس طرح کلکتہ لائبریری کے منتظمین سے بھی سلسلۂ مراسلت جاری رہتا ۔

کتابوں کے سلسلے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے ۔ دوسروں کا تو کیا ذکر اپنے عزیز ترین دوستوں تک کو اگر کوئی کتاب عاریتاً دیتے تو باقاعدہ رجسٹر پر اس کا اندراج کرتے اور واپسی کی تاریخ اور وقت بھی لکھ لیتے ، لیکن جب تاریخ مقررہ پر کتاب واپس نہ پہنچتی تو اگلے روز اپنے ملازم کو بھیج کر کتاب منگوا لیتے ۔

کتابوں سے ان کا شغف عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا ۔ ۱۹۰۳ میں جب سری نگر ایک قیامت خیز سیلاب سے دو چار ہوا تو جہاں دوسرے لوگ اپنے مال و اسباب اور خورد و نوش کی اشیا محفوظ جگہوں پر پہنچا رہے تھے منشی صاحب کو اپنی کتابوں کے ذخیرے کو محفوظ کرنے کی فکر تھی ۔ انھوں نے سب سے پہلے کتابوں کو محفوظ جگہ پہنچانے کا بندوبست کیا اور باقی سامان کو موخر رکھا ۔

وہ بڑے غور سے مطالعہ کرنے کے عادی تھے اور کسی کتاب کے مطالعے کے بعد اپنے تاثرات یادداشت کے طور پر کتاب کے حاشیہ پر درج کر دیا کرتے تھے ۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد محلہ نو پورہ سری نگر میں اپنا مکان بنوایا جس میں بڑے اہتمام سے کتب خانے کے لیے ایک الگ کمرہ تعمیر کرایا جس کی تمام کتابیں ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد کشمیر یونیورسٹی کی تحویل میں چلی گئیں ۔ اس طرح کتابوں کا یہ نادر ذخیرہ دست بُردِ زمانہ سے بچ گیا اور اس سے کشمیر کا علم دوست طبقہ اب استفادہ کر رہا ہے ۔

ان کے کتب خانے کی ہر کتاب پر انگریزی میں طبع شدہ چٹ چسپاں ہوتی تھی اور کتاب کا نمبر درج ہوتا تھا ۔ انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی نے اکتوبر ۱۹۳۸ میں سہ ماہی رسالہ "اُردو" کا اقبال نمبر شائع کیا ۔ رسالے کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۰ میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا جو اعلیٰ پایہ کے مضامین کے اعتبار سے لا جواب ہے ۔ اقبال نمبر کا یہ دوسرا ایڈیشن منشی صاحب کے زیرِ مطالعہ رہا ہے جن پر ان کے کتب خانے کی چٹ اور کتاب کا نمبر ۱۷۸۷ درج ہے ۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد منشی صاحب نے چار مضامین کے متعلق اپنے تاثرات مضامین کے خاتمے پر درج کیے ہیں جن سے ان کے اندازِ مطالعہ اور اقبال شناسی کا وافر ثبوت ملتا ہے ۔

''رومی، نطشے اور اقبال'' پر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، پروفیسر جامعہ عثمانیہ ، کا طویل مضمون ہے جو صفحہ ۵۵ سے صفحہ ۱۰۵ پر پھیلا ہوا ہے - منشی صاحب اس مضمون کے مطالعہ کے بعد مضمون کے نیچے خالی جگہ پر اپنے تاثرات درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ڈاکٹر عبدالحکیم کو مولانا روم کے کلام پر اچھا عبور ہے - چنانچہ انھوں نے رومی کے فلسفۂ ما بعد الطبیعیات پر کتاب لکھی اور علمائے جرمن سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی - علیٰ ہذا حکیم جرمن زبان جانتا ہے اور نطشے کے فلسفے کا اچھی طرح مطالعہ کر چکا ہے - وہ خود علامہ اقبال کا ہم عصر اور شاگرد ہے ، اس لیے اس نے تینوں مفکرین کے کلام پر اچھا مضمون لکھا ہے اور ان کے خیالات کی یگانگت کو خوب اُجاگر کیا ہے - مگر مضمون پڑھنے کا فی الجملہ اثر یہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے رومی اور نطشے سے ہی اخذِ خیالات کیا ہے - اس اثر کو رفع کرنے کے لیے عبدالحکیم نے اپنے مضمون کا خاتمہ علیحدہ خوب لکھا ہے جس سے اقبال کے علوِ مراتب کو برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے'' [آخر میں سراج الدین احمد - بشیر آباد (سری نگر ۲۷ جون ۴۰ء درج ہے] -

کتاب کا دوسرا مضمون ''اقبال اور آرٹ'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ، ڈی لٹ ، پیرس ، کا لکھا ہوا ہے - صفحہ ۱۰۶ سے صفحہ ۱۹۲ تک اس کا پھیلاؤ ہے - اس مضمون پر منشی صاحب نے مضمون کے آخر پر جو یادداشت لکھی ہے وہ یہ ہے :

''ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا یہ مضمون فلسفہ و ادب کی ایک مستقل کتاب سے کم نہیں جس میں فاضل مصنف نے علامہ اقبال کے ادب کے آرٹ پر نہایت دل زیب روشنی ڈالی ہے - علامہ مرحوم کے کلام پر بہت سی مصنّرفانہ تنقیدیں شائع ہو چکی ہیں مگر یہ تنقید یگانہ رنگ میں ہے جس میں علامہ مرحوم کے کلام کا نہایت ہی لطیف انتخاب دیا گیا ہے - علامہ مرحوم کی بلند فطرت ، قوتِ جذب و عشق اور خالص عشقِ خلاقِ فطرتِ انسانی کی لا انتہا وسعت کا صحیح رنگ دیکھنا ہو تو اس مضمون کا پڑھ لینا کافی ہے - کوئی شک نہیں کہ اقبال اور کلامِ اقبال پر بہت مبسوط کتابیں لکھی جائیں گی مگر ان کے ابتدائی میل و فرسخ کے نشان ایسے مضامین ہی ہوں گے - آرٹ کی تفصیل بہت ہی مشکل تھی مگر

مصنف نے کمال باریک بینی اور شگفتہ بیانی سے اس کی تشریح کلام اقبال کے تحت میں کی ہے (۲۹ جون ۴۰ء) ۔"

اقبال نمبر کا تیسرا مضمون "اقبال کا تصورِ زماں" ہے جسے سید بشیر الدین احمد صاحب ، بی ۔ ای ۔ ار کونم ، نے تحریر کیا ہے ۔ اس کے آخر میں منشی صاحب لکھتے ہیں :

"یہ مضمون نہایت عمیق و پُر مغز ہے اور ادراکِ زمان کے لیے عمیق خوض و مراقبے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ فلسفۂ قدیم و جدید کے طویل مطالعے کے بعد فلسفۂ زماں کسی قدر سمجھ میں آ سکتا ہے ۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اقبال اس تمام مطالعے کے بعد قرآنی نظریۂ پر پہنچا ہے جس کا ذکر اس نے اپنے فلسفی لیکچروں میں تفصیل سے کیا ہے مگر ایسے مسائل درمیانہ درجے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی دماغی یا قلبی گرفت میں ذرا مشکل سے آتے ہیں (۱۹۴۰ - ۷ - ۱) ۔"

اقبال نمبر کا چوتھا مضمون علامہ اقبال کی "آخری علالت" پر جناب سید نذیر نیازی کا لکھا ہوا ہے جس پر منشی صاحب نے صرف ڈیڑھ سطر میں اس کی تعریف کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

"الحق کہ نیازی صاحب کا یہ مضمون بہت قیمتی معلومات سے بھرا ہوا ہے ۔ (۱۹۴۰ - ۷ - ۱) ۔"

اقبال نمبر کا تیسرا اور چوتھا مضمون منشی صاحب نے ایک ہی نشست میں پڑھا ہے کیونکہ ان دونوں مضامین کے آخر میں ایک ہی تاریخ درج ہے ۔

اقبال نمبر کے مضامین کے متعلق منشی صاحب کے تاثرات پڑھ کر ان کے علم و فضل اور ذوقِ مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ اس لیے ان کے تاثرات بطورِ تبرک اس تحریر میں شامل کر دیے ہیں ۔

منشی صاحب کی شخصیت بڑی رعب دار اور آواز پاٹ دار تھی ۔ کسی جلسے یا مشاعرے میں تقریر کرتے یا شعر پڑھتے تو دور و نزدیک سنائی دیتی ۔ بھاری بھرکم جسم تھا ۔ اس پر شہپروں نے ان کی

شخصیت کو اور بھی دل آویز اور باوقار بنا دیا تھا ۔ وہ جس جلسے یا مشاعرے میں جاتے صدرات کی کرسی ان کی منتظر ہوتی اور ہر محفل میں وہ اپنی دلچسپ شخصیت، سخن فہمی اور حاضر جوابی کی بدولت چھا جاتے ۔

عبدالحمید سالک مرحوم ''نیازمندان لاہور'' کے عنوان سے ہفت روزہ ''چٹان'' کی ۲۷ فروری ۱۹۵۶ کی اشاعت میں ان کی صدارت کا ایک واقعہ لکھتے ہیں جسے انھوں نے اپنی تصنیف "سرگزشت" میں بھی درج کیا ہے :

''بزمِ ادب پنجاب کے مشاعرے بہت شگفتہ اور با رونق ہوتے تھے ۔ سالک ، حفیظ اور ہری چند اختر تو مستقل شاعر تھے ۔ ایک دو دفعہ سید احمد شاہ بخاری نے بھی اپنا کلام سنایا اور علاوہ بریں بہت اچھے اچھے خوش گو شعرا اس مشاعرے میں شریک ہوتے تھے ۔ ایک اجلاس کی صدارت کے لیے حفیظ صاحب منشی سراج الدین صاحب ، میر منشی ریذیڈنسی کشمیر ، کو کہیں سے گھیر گھار کر لے آئے ۔ منشی سراج الدین نہایت باغ و بہار آدمی تھے۔ جسٹس میاں شاہ دین ، میر غلام بھیک نیرنگ ، چوہدری خوشی محمد ناظر ، مولوی محرم علی چشتی ، منشی محمد الدین فوق ، اور دوسرے بزرگوں سے ان کا گہرا تعلق تھا ۔ کشمیر میں یہ سب لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے اور ہر سال بہت بھر پور مجلسیں رہا کرتی تھیں ۔ میر منشی صاحب کو بلا مبالغہ اُردو اور فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے اور لطف یہ کہ ایک ایک مضمون پر بیسیوں اشعار بے تکلف سنا دیا کرتے تھے ۔ موقع و محل کی مناسبت سے اشعار پڑھ دینا ان کا ایسا خاصہ تھا جس کی مثال ان کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی ۔ ہمارے مشاعرے کے صدر ہوئے تو کلماتِ صدارت میں فرمایا : 'میں سالک صاحب کو ان کے بچپن سے جانتا ہوں اور ان کے والدِ محترم کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل تھا اور میں ننھے سالک کو دیکھ کر اس زمانے میں کہا کرتا تھا :

بالائے سرش ز ہوش مندی می تافت ستارۂ بلندی

'آج دیکھتا ہوں کہ وہ پنجاب کی بزمِ ادب کے صدر نشیں ہیں ۔ بقولِ حافظ :

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد دلِ رمیدۂ ما را انیس و مونس شد

اور یہ حفیظ جالندھری ! پانچ چھ جماعتیں پڑھ کر مدرسے سے بھاگ گئے ، لیکن آج ہمارے ملک کے ممتاز شاعر ہیں ۔ بقولِ حافظ :

نگارِ ما کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

اور اب مجھے دیکھیے ، کوہستانِ کشمیر کا رہنے والا لاہور میں اپنے بعض معاملات کے لیے در بدری کر رہا تھا کہ حفیظ صاحب نے پکڑ کر کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا ۔ بقولِ حافظ :

بہ صدرِ مصطبہ ام می نشاند اکنوں دوست
گدائے شہر نگہ کن کہ میر مجلس شد'

''غرض منشی صاحب نے حافظ کی ایک پوری غزل موقع و محل کی مناسبت کے ساتھ استعمال کر لی ۔ مشاعرہ داد و تحسین کے غلغلوں سے ہنگامہ زار بن گیا ۔ اس کے بعد جب شعرا نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو منشی صاحب رک نہ سکتے تھے ۔ جہاں کہیں کسی شاعر نے کوئی ایسا شعر پڑھا جس کا مضمون پرانے شعرا کے کلام میں بھی موجود ہوا منشی صاحب جھٹ کھڑے ہوئے اور اس مضمون کے آٹھ دس شعر فارسی اور اُردو میں سنا دیے اور یہ قصہ اتنا حد سے چلا کہ مجھے بار بار منشی صاحب کو روکنا پڑتا تھا کہ شاعر کو غزل تو پڑھنے دیجیے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ شرکائے مشاعرہ منشی صاحب کے اس تبحر کی وجہ سے بے حد محظوظ اور مستفید ہوئے تھے ۔''

علامہ اقبال منشی صاحب کے ذوقِ ادب اور سخن فہمی کے بڑے معترف تھے ۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً انھیں اپنا تازہ کلام اپنے ہاتھ سے نقل کر کے بھیجتے رہتے تھے اور ایک سخن شناس کی داد کا لطف اُٹھاتے تھے ۔ ''پرندے کی فریاد'' اور کئی دوسری نظمیں اور غزلیں مرحوم کے ورثا کے پاس بطورِ تبرک محفوظ تھیں جن کا ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد کچھ پتا نہ چلا ۔ جب ''اسرارِ خودی'' شائع ہوئی تو ایک جلد ان کو بھی تحفتہً بھیجی ۔ منشی صاحب ان دنوں گلمرگ میں تھے ۔ وہیں سے اُنھوں نے مثنوی پر تبصرہ کر کے بھیج دیا ۔ اتفاق سے وہ تبصرہ جو نجی خط کی شکل میں تھا لاہور کے کسی روزنامہ میں چھپ گیا ۔ اس تبصرے میں ہندوستان کے سیاسی امور بھی زیرِ بحث آ گئے تھے ۔ منشی صاحب کی نظر سے یہ مطبوعہ خط گزرا تو انھیں بڑی کوفت ہوئی اور انھوں نے علامہ کو دوستانہ شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ وہ نجی خط تھا ، اس کی اشاعت

مقصود نہ تھی جب کہ میں انگریز کا ملازم ہوں ، مزید برآں انگریز کے پولیٹیکل محکمے سے وابستہ ہوں ۔ جواب میں علامہ اقبال نے خط کی اشاعت سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی ۔ اس طرح یہ بات آئی گئی ہو گئی ۔

منشی صاحب کے فرزند مسٹر امیر الدین کا بیان ہے کہ ۱۹۳۶ میں ایک انگریز مستشرق بریگیڈیر جنرل ٹیوٹ جو انڈین آرمی سے ریٹائر ہو گئے تھے علامہ اقبال سے ملے ۔ ان کو فارسی ادب کا بڑا ذوق تھا اور وہ ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ اور شرح انگریزی میں کرنا چاہتے تھے ۔ انگریز مستشرق نے خواہش ظاہر کی کہ علامہ ان کے ہمراہ کشمیر چلیں اور دو تین ماہ وہاں قیام کریں تا کہ وہ ان سے اپنے منصوبے میں ان کی استمداد حاصل کریں ۔ علامہ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس دعوت کو قبول نہ کر سکے ۔ البتہ انھوں نے منشی سراج الدین کے نام تعارفی خط لکھ دیا کہ آپ بریگیڈیر جنرل صاحب کو ''جاوید نامہ'' کی مطلب فہمی میں مدد دیں ۔ منشی صاحب نے علامہ کی اس خواہش کا احترام کیا اور بڑی خندہ پیشانی سے مہمان کا خیر مقدم کیا اور انھیں مکمل تعاون کا یقین دلایا ۔ چنانچہ یہ معمول ہو گیا کہ جنرل صاحب صبح سویرے منشی صاحب کے بنگلہ پر پہنچ جاتے اور منشی صاحب انھیں ''جاوید نامہ'' کے مفہوم سمجھنے میں مدد دیتے ۔ اس سلسلے میں بحث بھی ہوتی ۔ اتنے میں منشی صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو جاتا ۔ وہ ناشتہ بھی کرتے جاتے اور اشعار کی تشریح بھی جاری رہتی ۔ کوئی نکتہ جو جنرل صاحب کے ذہن میں نہ ہوتا سمجھ میں آ جاتا تو نہ صرف خوشی سے جھوم اُٹھتے بلکہ اُٹھ کر ناچنے بھی لگتے اور اس خوشی میں بادۂ احمر کا جام بھی لنڈھا لیتے جو وہ تھرموس میں بھر کر ساتھ لاتے تھے ۔

منشی صاحب دفتر جاتے تو جنرل صاحب بھی اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹ جاتے ، لیکن اکثر اوقات منشی صاحب کی تشریحات قلم بند کرنے کے لیے کمرے میں بیٹھے رہتے ۔ اشعار کے مفہوم اور تشریح کے دوران کبھی کبھی کسی مسئلے پر اختلاف بھی رونما ہو جاتا تو اس صورت میں علامہ سے رجوع کیا جاتا اور علامہ عام طور پر منشی صاحب کی وضاحت سے

اتفاق کرتے ۔ اس طرح لگا تار تین مہینے یہ نشستیں جاری رہیں اور جب کام تکمیل کو پہنچ گیا تو جنرل صاحب بڑے مطمئن ہو کر واپس چلے گئے ۔ وہ منشی صاحب کی سخن فہمی اور اقبال شناسی کا بہت گہرا نقش لے کر گئے ۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا منصوبہ جو پایہء تکمیل کو پہنچ گیا تھا زیورِ طبع سے بھی آراستہ ہوا یا نہیں ۔

ریاستوں میں ریذیڈنسی کے عملے کی بڑی پوزیشن ہوتی تھی ۔ منشی صاحب نے میر منشی کی حیثیت سے کم و بیش پچاس سال ملازمت میں گزار دیے ۔ کچھ منصب کی مناسبت سے اور کچھ ان کی اپنی دل کش شخصیت کے اعتبار سے ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا ۔ برِصغیر کے شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ کئی راجوں ، مہاراجوں اور نوابوں سے بھی ان کے بڑے خوش گوار تعلقات تھے ۔ وہ اپنے منصب کو نبھانا خوب جانتے تھے ۔ چاہتے تو ہندوستان میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہو سکتے تھے لیکن کشمیر کی محبت ان کے دل میں اتنی جا گزیں رہی کہ وہ اپنے منصب پر ہی قناعت کر کے بیٹھے رہے لیکن کشمیر سے جدا ہونا گوارا نہ کیا ، اس لیے کہ :

ع فراغتے و کتابے و گوشہء چمنے

ایسی نعمتیں انھیں کسی دوسری جگہ کہاں میسر آ سکتی تھیں ! ''انجمن مفرح القلوب'' کے جلسوں کی دلچسپیاں اور کشمیر کے باغات کی سیر کہاں نصیب ہو سکتی تھی ! انجمنِ مفرح القلوب کشمیر کی ایک ثقافتی اور ادبی جماعت تھی جس میں ریذیڈنسی اور حکومت کے اعلیٰ مسلمان افسر شامل تھے ۔ ہر اتوار کو باغوں اور ڈل کی باجماعت سیر کرتے ۔ اس سیر و تفریح میں موسیقی کا حصہ بھی ہوتا اور شعر و سخن کا رنگ بھی جمتا ۔ برِصغیر کی بڑی بڑی شخصیتیں کشمیر جاتیں تو ''مفرح القلوب'' کی نشستوں میں ضرور شامل ہوتے ۔ ان شخصیتوں میں شیخ عبدالقادر ، جسٹس ہمایوں اور علامہ اقبال شامل تھے ۔ علامہ اگرچہ ایک ہی بار کشمیر گئے تاہم اُنھوں نے مختصر قیامِ کشمیر کے دوران اس انجمن کے تفریحی مشاغل میں حصہ لیا جو نصف صدی تک کشمیر کے باغات میں مسرتوں کے پھول بکھیرتی رہی ۔

ملازمت سے سبک دوش ہو کر وہ کچھ علمی اور ادبی کام کرنا چاہتے تھے جن کو وہ سرکاری ذمہ داریوں کے دوران میں انجام نہ دے سکے ، لیکن موت نے فرصت نہ دی اور ۱۹۴۰ کے لگ بھگ علامہ اقبال کی وفات کے کم و بیش دو سال بعد سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے - ان کی وفات سے کشمیر کے ادبی اور ثقافتی اداروں میں جو خلا پیدا ہوا وہ کبھی پُر نہ ہو سکا :

ع اب نظر کاہے کو آئیں گی وہ تصویریں کہیں